باب چہارم

کشمیر، پہلا معرکہ، پہلی محبت

کشمیر سپاہی کی پہلی محبت تھی۔ ستمبر 1947ء میں ضابطے کے مطابق سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی پانے کے کچھ عرصہ بعد کوہالہ کے پل پر اس کی ڈیوٹی لگائی گئی، جہاں انہیں سرحد پار ڈوگرہ فوج کی چوکی پر نظر رکھنا تھی۔ میجر راجہ اسلم بھی یہاں کچھ دن ان کے ساتھ رہے، وہ ان کے افسر ہی نہ تھے، اب ان کے دوست بھی بن چکے تھے۔ لیفٹیننٹ اختر نے کشمیر کے محاذ پر پہلی جنگ لڑی اور نہ صرف اپنوں بلکہ دشمنوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ یہاں انہوں نے قبائلی لشکروں کو سرحد پار جاتے دیکھا اور احکامات کے برعکس انہیں کشمیر جانے میں مدد فراہم کی۔ بعدازاں انہوں نے کشمیر میں بریگیڈئر اور جنرل کے طور پر فرائض انجام دیے۔ کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں پر انہوں نے اپنے سپاہیوں کی تربیت کرتے ہوئے 'حکم اور حملے کے درمیان' کم از کم وقت کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ اپنے جوانوں کو اسلحہ سے بہترین طور پر کام لینے اور جنگ کے ہنگام میں پہاڑوں پر قبضہ کرنے کے ہنر سے آشنا کیا۔ اگر سپاہی سے اس کی خواہش کے بارے میں پوچھا جاتا تو یقیناً وہ کشمیر کے محاذ پر اپنے ہنر اور حوصلے کے آزمائش کرنے کا فیصلہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سالہا سال تک ذہنی اور عملی طور پر کشمیر کے محاذ پر ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کرتے رہے۔

لیفٹیننٹ اختر ایک رات کوہالہ کے پل پر گشت کر رہے تھے، جس کے پار پاکستان سے stand still کا معاہدہ کر لینے والا ڈوگرہ ہری سنگھ ابھی تک سریر آرائے سلطنت تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ انہیں پل کے اوپر دکھائی نہیں دینا چاہیے، جو پاکستان اور کشمیر کی سرحد متعین کرنے والے دریائے جہلم پر واقع ہے۔ اختر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پل سے پیچھے ہٹ آئے، لیکن اتفاق سے جب دوسرے روز علاقے کا ڈوگرہ کمانڈر دورے پر آیا تو اس طرف سے نشاندہی کی گئی کہ سرزمین کشمیر کے آغاز کی نشاندہی کرنے والا سنگ میل پل کے پار واقع ہے، لہٰذا دریا اور اس پر بنا ہوا پل پاکستان کی حدود میں واقع ہیں۔ ڈوگروں کے لیے اس دلیل کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کوہالہ سے متصل بلندی پر بنے پاک فوج کے خوبصورت مرکز میں، جہاں آج بھی مختصر سی عسکری چوکی قائم ہے، اگرچہ دو چھوٹی توپوں، چند مشین گنوں اور گنتی کی رائفلوں کے سوا کچھ نہ تھا، سپاہیوں کی تعداد بھی سو سے کم تھی، لیکن پاکستانی فوجیوں کے پراعتماد اور جارحانہ رویے نے ڈوگروں کو مرعوب کیے رکھا۔ انہوں نے عیدالضحیٰ کے روز کچھ بکرے تحفے کے طور پر بھیجے اور یہ اشارہ دیا کہ وہ تصادم نہیں چاہتے۔ اگرچہ بعدازاں ایک رات پل کو اڑانے کی کوشش کے بعد اس وقت اپنی چوکی چھوڑ کر فرار ہو گئے، جب کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کی کوششوں کے بعد جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔

اب ایبٹ آباد اور مری کے راستے قبائلی لشکر رات کی تاریکی میں کشمیر جانے لگے۔ انگریز کمانڈر انچیف اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے انگریز افسروں کی

طرف سے کوہالہ کی چوکی پر ہدایات موصول ہوئیں کہ قبائلیوں کو سرحد پار کرنے کی اجازت نہ دی جاء، نہ صرف یہ بلکہ ہر قسم کی ٹریفک روک دی جائے۔ لیفٹیننٹ اختر دن کی روشنی میں تو ان ہدایات کی پابندی کرتے ،لیکن جب رات کی تاریکی چھا جاتی اور جہلم کے دونوں طرف سرد ہوائیں بہنے لگتیں تو وہ پل کی زنجیر ہٹا کر اسے آمد ورفت کے لیے کھول دیتے۔صبح کے چار بجے تک ، جب فجر کی اذان میں تھوڑا سا وقت باقی ہوتا، یہ زنجیر کھلی رہتی ،جیسا کہ عمر بھر ان کا مزاج رہا، وہ کشمیر کی جنگ پر کم ہی اظہار خیال کرتے اور جب بولتے تو زیادہ تر جنگ کے عملی پہلوؤں کی بات کرتے ۔ وہ برسر جنگ کشمیریوں کی عملی مدد کرنے کے بارے میں سوچتے رہتے۔بعض اوقات چوکی والی پہاڑی پر یا پل پر گشت کرتے ہوئے وہ ٹکٹکی باندھ کر سرحد پار دیکھنے لگتے اور اس عالم میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ بعد میں بھی جب انہوں نے باغ اور مری میں اپنے عسکری فرائض انجام دیے، انہیں کئی بار کشمیر کی سرحدوں پر کھڑے، سرحد پار کی روشنیوں کو خواب کے عالم میں دیکھتے ہوئے پایا گیا۔ وہ اپنے خواب میں جیتے لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھنے والے آدمی تھے، لیکن راوی کا بیان ہے کہ ایک بار سرحد کی اس طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ باوردی آدمی نے اپنے آنسو پونچھے اور زبان سے کچھ نہ بولا۔اس کی دنیا اس کے من میں آباد رہتی تھی۔ وہ اس کی روشنیوں ،تاریکیوں اور ویرانیوں میں تنہا راہیں تلاش کرتا اور اپنے احساسات پر ایک چوکیدار کی طرح نگراں رہتا۔ وہ اپنے جذبات میں بہت کم کسی کو شریک کرتا تھا۔

اہل کشمیر اور قبائلی آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھے، لیکن اب راولپنڈی کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کوہالہ کی چوکی پر وقفے وقفے سے یہ پیغام موصول ہوتا رہا کہ پل سے قبائلیوں کو گزرنے نہ دیا جائے۔ پھر ایک شام ایک انگریز بریگیڈیئر بنفس نفیس کوہالہ پہنچ گئے۔انہوں نے چوکی پر شام کی چائے پی، اور کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا، مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ لوگ رات کو دس بجے پل کھول دیتے ہیں۔میجر راجہ اسلم نے تردید کی اور کہا کہ وہ احکامات کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش سا بیٹھا رہا۔معمولاً وہ جب کبھی دورے پر آتا، تو رات کی تاریکی گہری ہونے سے پہلے ہی واپس چلا جایا کرتا تھا، لیکن آج اس کے تیور بدلے بدلے سے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر کہا، آپ لوگ احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔کیا تماشا تھا کہ ایک ملک اپنی اہم ترین جنگ لڑ رہا تھا اور پیشہ ور فوج کے غیر ملکی افسر اسے غیر جانبدار اور غیر متعلق رکھنے پر مصر تھے۔ان کے پاکستانی ماتحت علی الاعلان ان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ ملک کی سلامتی کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور ہیں۔اگر ان میں سے کوئی ایسا کہنے کی جرات کرتا تو اس کا کورٹ مارشل کیا جا سکتا تھا۔ بریگیڈیئر نے دس بجے رات کا کھانا کھایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔سوال یہ تھا کہ اگر اس نے رات یہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا تو کیا ہوگا۔قبائلیوں کے ایک دستے کو آج رات یہاں سے گزرنا تھا، اس کے ساتھ پہلے سے یہ بات طے تھی۔ جب وہ اچانک نمودار ہوں گے، روکے جانے پر واویلا کریں گے اور وعدہ یاد دلائیں گے تو کیا ہوگا۔ وہ پیشہ ور فوجی نہیں تھے کہ اشاروں میں بات سمجھائی جا سکتی۔ پھر زبان کی وجہ سے ابلاغ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔تو کیا آج بھید کھل جائے گا؟ کیا لیفٹیننٹ اور میجر کی جواب طلبی ہو گی اور انہیں فوج سے رخصت کر دیا جائے گا۔

راجہ اسلم نے لیفٹیننٹ کرنل کو ایک طرف لے جا کر اپنی تشویش سے آگاہ کر دیا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔میجر اپنے ماتحت کا جواب سن کر ششدر اور بھونچکا رہ گیا۔''یہ ملک کی آزادی اور بقا کا سوال ہے۔'' اس نے کہا'' قبائلی ہمیشہ کی طرح آج رات بھی پل پار کریں گے، جہاں تک بریگیڈیئر کا تعلق ہے، اسے اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اپنی بات پر مصر رہا تو میں قومی مفاد کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے اس غیر ملکی کو قتل کر دوں گا۔''۔ پھر ہمیشہ کے ٹھنڈے لہجے میں اس نے کہا،'' اس ہنگامے میں کون جانتا ہے کہ کس پر کیا بیتی ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس کے پاس اب

بھی سوال کا جواب موجود تھا، ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی خطرہ مول لینے کو تیار تھا، اور وہ ہمیشہ کی طرح ہیجان سے پاک تھا۔

پاک بھارت تصادم کا منظر دیکھتے ہوئے انگریز افسر جو اپنے کمانڈر انچیف سے ہدایات وصول کرتے تھے، اس صورت حال کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے، روایت کے مطابق انگریز کمانڈر انچیف نے پاکستانی فوجوں کو کشمیر کی طرف حرکت دینے کے بارے میں قائداعظم کے احکامات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری طرف انگریز افسر بخوبی جانتے تھے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو غیر جانب دار رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے، چنانچہ وہ اکثر چشم پوشی سے کام لیتے۔ اس انگریز بریگیڈئر نے بھی آخر کار یہی کیا۔ رات کا کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ واپسی کے لیے تیار ہو گیا، اور جاتے جاتے اس نے راز داری کے انداز میں میجر اسلم کو کہا، ''پل کو زیادہ دیر تک مت کھولا کرو۔''

میجر اسلم اب اپنے ماتحت کے مداح ہوتے جا رہے تھے، اگرچہ وہ اسے فوجی ضابطوں کی یاد دہانی کراتے اور ان سے انحراف پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے، لیکن اب وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے اور ایسے لوگ محض ضابطوں کی پاسداری کے لیے نہیں بنے ہوتے۔ ایک اور واقعہ نے انہیں اس بارے میں اپنی رائے کو پختہ تر کرنے کا موقع دیا۔ اس رات وہ مری میں تھے، جب انہیں اس بارے میں پتا چلا۔ لیفٹیننٹ کرنل اختر معمول کے مطابق کوہالہ کے پل پر پہرہ دے رہے تھے کہ بھارتی طیارے فضا میں نمودار ہوئے اور انہوں نے پل کا نشانہ لے کر بم گرائے کہ سرزمین کشمیر تک پاکستانیوں کی رسائی مشکل بنا دی جائے۔ پل تو محفوظ رہا لیکن کئی بم اس سے متصل بازار میں جا گرے، جہاں 43 سال گزر جانے کے باوجود آج بھی وہی مختصر سی آبادی موجود ہے۔ ایک آدھ بم دریا میں گرا اور کچھ پہاڑوں میں ضائع ہو گئے۔ بازار میں گرنے والا 25 پونڈ کا بم ایک بھاری گیند کی طرح سڑک پر آ رہا اور پھٹا نہیں۔ بھارتی جہازوں کے واپس چلے جانے کے بعد دیہاتی بھاگتے ہوئے پل کی طرف گئے اور انہوں نے لیفٹیننٹ کو اس بم کے بارے میں بتایا، جیسا کہ اس کا مزاج تھا، اس نے ان کی بات توجہ سے سنی اور پھر معمول کے انداز میں اس طرف بڑھا، جہاں بم پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دوسروں کو پیچھے رہنے کے لیے کہا، اپنی رائفل ایک سپاہی کو تھمائی اور خاموشی سے آگے بڑھا، پھر دونوں ہاتھوں سے بم اٹھا کر دریا کی طرف اچھال دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ پل پر گشت کرنے میں مصروف تھا۔

اس واقعہ پر لیفٹیننٹ کرنل کے افسر کا ردعمل کیا تھا، بوڑھا جرنیل آج اپنے ماتحت کی شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے، لیکن اس کا کہنا ہے کہ جب اسے مری میں ٹیلی فون پر اس بارے میں بتایا گیا تو اس نے سختی سے لیفٹیننٹ کو ڈانٹا اور کہا کہ برخوردار، تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، اپنے سپاہیوں اور بازار میں کھڑے تماشائیوں کی زندگیوں کو بھی۔ اگر بم پھٹ جاتا تو کیا ہوتا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں جناب۔'' اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ اگر دوسری بار ایسا ہی واقعہ پیش آتا تو کیا وہ ضابطے کی پابندی کرتا، اور بم سے دور کھڑا رہتا؟ وہ ایک نافرمان آدمی نہیں تھا۔ شاید اب کی بار اس کی جدت طبع کوئی دوسری راہ تلاش کر لیتی اور شاید اب کی بار وہ جواب طلبی سے بچنے کی کوشش کرتا۔

جنگ جاری تھی اور کوہالہ کی چوکی سے خاموشی کے ساتھ مجاہدین کی مدد کا عمل بھی۔ ایک رات مسلم کانفرنس کے سربراہ اور کشمیر کی جنگ آزادی کے سیاسی سالار چودھری غلام عباس خاموشی سے کوہالہ پہنچے اور انہوں نے سوال کیا کہ کیا فوجی افسران ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ انہیں پل سے کچھ فاصلے پر دریا پار کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ ان کے لیے راتوں رات رسیوں کا پل بنایا گیا۔ انہیں کوہالہ کی ڈوگرہ چوکی سے فرار ہونے والوں کی باقی ماندہ رائفلیں بھی دی گئیں۔ کشمیریوں نے اپنی آزادی کی جنگ اسی بے سروسامانی اور پاک فوج کی ایسی ہی خاموش اور محدود امداد سے لڑی۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان جو تب چودھری غلام عباس کے شمشیر زنوں میں سے تھے، کبھی کبھی مظفر آباد کے ایوان صدر سے کار میں راولپنڈی آتے ہوئے

کچھ دیر کے لیے کوہالہ سے آگے جہلم کے اس کنارے پر رک جاتے، جہاں سے وہ سرد راتوں میں رسیوں کے اس پل کی مدد سے اور کبھی اس کے بغیر دریا کو پار کر کے اپنے دن پاکستانی جنگل میں گزارا کرتے تھے۔ کیا انہیں یاد ہے کہ ادھر کچھ فاصلے پر پاک فوج کا ایک لیفٹیننٹ راتوں کو کوہالہ کے پل پر ٹہلا کرتا تھا اور خاموشی سے کشمیریوں کی مدد کرتا تھا۔

جنگ پھیلنے لگی اور پل سے آگے کا علاقہ آزاد کرا لیا گیا، تو لیفٹیننٹ اختر اور میجر اسلم کبھی کبھار بے تاب ہو کر آگے نکل جاتے، کبھی کبھار ان کے اس اسلحہ اور دوسرا ساز و سامان بھی ہوتا۔ وہ جدید جنگ سے ناآشنا قبائلیوں کی راہنمائی کرنے اور انہیں مشورہ دینے کے لیے بے چین ہوتے۔ فوجی ضابطے ان کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ وہ کبھی اس رکاوٹ کے ادھر اپنے اضطراب کے ساتھ جمے رہتے اور کبھی اس پر قابو نہ پا کر کسی جیپ یا ٹرک میں اس طرف نکل جاتے۔ اسی عالم میں ایک بار وہ لوٹ کر آئے تو انہوں نے بریگیڈ کمانڈر کو انتظار کرتے پایا۔ اس نے ترپال کے نیچے بڑی مشین گن کو دیکھا اور برہم ہو گیا۔ وہ ان کا سالار تھا، لیکن یہ اس کی جنگ نہیں تھی۔ وہ چیخا چلایا اور اس کے ماتحت خاموشی سے سنتے رہے، آخر کار وہ بھی خاموش ہو رہا اور واپس چلا گیا۔ اگر لیفٹیننٹ اپنے جذبات کا اظہار کرنے والا آدمی ہوتا تو شاید وہ کوہالہ کی پہاڑی پر کھڑا ہو کر چیخ اٹھتا کہ یہ دفاع وطن کی کیسی جنگ ہے جو اتنی بے بسی اور لاچاری سے لڑی جا رہی ہے۔ یہ کیسا عجیب زمانہ ہے کہ اپنے وطن سے محبت کے ''جرم'' کو چھپانا اور ایک غم کی طرح پالنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اپنے احساسات کو الفاظ میں نہیں، عمل میں بیان کرنے والا آدمی تھا، اور پھر عمل کا لمحہ آ پہنچا، جب اس کے دست و بازو آزاد تھے، اس کی پرواز خیال آزاد تھی، اسے ایک معرکے نے مدعو کر لیا، اس کا حوصلہ اور ہنر آزمائش کی سان پر تھے۔

کشمیر کی پانڈو ٹیکری کے اس معرکے سے پہلے جس نے لیفٹیننٹ اختر کو ایک بہادر اور پر جوش افسر کی حیثیت سے فوج میں متعارف کرایا، اور اگلے چار عشروں کے لیے ایک بے مثال عسکری کیریر کی بنیاد فراہم کی، انہیں ایک ایسی ذمے داری سونپی گئی، جس کا ان کے فوجی ریکارڈ میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا مہاجروں کی تلاش کے لیے پوٹھوہار سے علاقے سے آنے والی دو سکھ کمپنیاں اپنے مشن کی تکمیل کے بعد واپس جا رہی تھیں۔ فوج کے جاسوسی کے ذرائع نے مطلع کیا کہ واپس جانے والے مغضوب الغضب سکھ فوجی راستے میں گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہیں۔ ایک دن آدھی رات کو جہلم سے سر ظفر اللہ کے برادر نسبتی جنرل نذیر نے ۲ فیلڈ رجمنٹ کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو یہ اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ امرتسر جانے والی یہ سکھ کمپنیاں راستے کی بعض شہری تنصیبات کے علاوہ سرائے عالمگیر سے آگے دریائے جہلم پر رسول ہیڈ ورکس کو تباہ کرنا چاہتی ہیں۔

یہ 1948ء میں موسم بہار کے دن تھے۔ لیفٹیننٹ اختر کو سوتے سے بیدار کر کے کہا گیا کہ وہ 60 سپاہیوں کے ساتھ فوراً سکھ کمپنیوں کے تعاقب میں روانہ ہو جائیں۔ پھر کمانڈر نے قدرے متفکر ہو کر کہا، اختر، ان کی تعداد آپ سے دوگنا ہے۔ ان کے پاس بھاری مشین گنیں اور مارٹر توپیں ہیں، جبکہ ہم آپ کو ہلکی مشین گنوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں دے سکتے۔'' کمانڈر کو آدھی رات کی یہ گفتگو آج بھی یاد ہے۔ ''سر، آپ کوئی فکر نہ کریں۔''، اختر نے کہا، ''ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔'' لیکن مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ اپنے سپاہیوں، گاڑیوں اور ہلکی مشین گنوں کے ساتھ اختر سکھوں کا تعاقب کرتے رہے۔ انہوں نے فاصلہ برقرار رکھا اور ان کی نگرانی کرتے رہے۔ وہ راتوں کو رک جاتے، جنگل میں برا بھلا کھانا پکا کر کھاتے اور دشمن پر نگاہ رکھتے۔ معلوم نہیں، سکھوں نے تخریب کاری کا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں تھا، یا بعد ازاں انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ بارہ دن کے بعد اختر اپنے سپاہیوں کے ساتھ لوٹ آئے، جب سکھ پاکستانی سرحد عبور کر کے بھارت داخل ہو رہے تھے۔ راولپنڈی پہنچ کر اپنے کمرے میں جرابیں اتارتے ہوئے لیفٹیننٹ اختر نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، ''کیا ہم یونہی میدانوں میں مارے مارے پھریں گے، کیا ہماری قسمت میں کوئی مقابلہ نہیں لکھا۔''

رجمنٹ کا کمانڈر اس وقت ایبٹ آباد کی کاکول اکیڈمی میں لیکچر دینے گیا ہوا تھا، جب اسے حرکت کرنے اور کشمیر پہنچنے کا حکم ملا۔ انگریز کرنل نے یہ حکم دیتے ہوئے بتایا کہ وہ پاکستانی سرحد پار کر کے کشمیر نہیں جائے گا۔ محمد خان کیانی نامی ایک پاکستانی میجر (بعد میں بریگیڈئر) کو قیادت کی ذمے داری سونپی گئی، اور رجمنٹ کھاریاں کے راستے میرپور سے آگے کوٹلہ، اعواناں کی طرف روانہ ہوگئی۔ رجمنٹ کو تیاری کے لیے صرف دو گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ پیغام واضح تھا کہ یہ جنگ کی تیاری ہے۔

لیفٹیننٹ اختر اولاً توپ خانے کے عقب میں تھے، لیکن پھر انہیں آگے بڑھنے کا حکم ملا، آگے اور آگے اور آگے۔ اب معرکہ کارزار گرم ہونے والا تھا اور مشکل ذمے داریاں زیادہ ذمہ دار اور اہل لوگوں ہی کو سونپی جاسکتی تھیں۔ اختر بہترین لوگوں میں سے بہترین سپاہی تھے، لہٰذا جب جولائی 1948ء میں پانڈو کی دس ہزار فٹ بلند چوٹی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو وہ اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے والے بنیادی لوگوں میں سے ایک تھے۔

قبائلی یلغار کی وجہ سے دشمن پہلے ہی بے حد چوکنا تھا، لہٰذا اس حملے کے لیے معمول سے کہیں زیادہ رازداری کی ضرورت تھی۔ ایک سے زیادہ گشت کرنے والے دستے اگلے علاقوں میں بھیجے گئے اور ضروری معلومات حاصل کر لی گئیں۔ کسی جنگ میں رزم آرا لشکروں کے پاس منصوبہ بندی کے لیے کبھی کافی وقت نہیں ہوتا، اور یہ جنگ تو ایک عجیب افراتفری کے عالم میں لڑی جارہی تھی، ناکافی سپاہ، محدود اسلحہ اور گولہ بارود، انتہا تو یہ ہے کہ بلندی کی اس جنگ کے لیے پاک فوج کے پاس کافی اور موزوں وائرلیس سیٹ بھی موجود نہ تھے۔ توپ خانے کے ذریعے متوقع نشانوں پر حملوں کے لیے جسے اس معرکے میں اہم ترین کردار ادا کرنا تھا، اعداد و شمار مرتب کر لیے گئے۔ 101 بریگیڈ کے کمانڈر اکبر خان نے راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے نائبین کی مدد سے پاکستانی دستوں کی حکمت عملی اور دشمن کے متوقع ردعمل پر غور و خوص کیا۔ قبائلیوں کی آفریدی فورس کے علاوہ تین آبزرور کمپنیاں اے، بی، سی تشکیل دی گئیں۔ لیفٹیننٹ اختر اے کمپنی کے ساتھ تھے۔ بریگیڈئر اکبر خان کی تحریری یادداشت کے مطابق میجر قیوم شیر، (بعد میں بریگیڈئر) کی قیادت میں آگے بڑھنے والی بی کمپنی دشمن کی زبردست گولہ باری کی زد میں آگئی، کئی مجاہد شہید ہوئے، اور کمپنی کی پیش قدمی دم توڑ گئی۔ اب سارا بار اے اور سی کمپنی پر آپڑا تھا۔ اس کے جانبازوں کو جنہیں ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے لیے کہا گیا تھا، صورت حال کی نزاکت کا احساس تھا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا، جب دونوں کمپنیوں کے جانباز پانڈو گاؤں میں داخل ہوئے۔ اے کمپنی نے یہاں پوزیشنیں سنبھال لی اور بی کمپنی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، تب یکا یک دشمن نے ان بہادروں پر فائر کھول دیا۔ اچانک شروع ہونے والی گولہ باری اتنی غیر متوقع تھی کہ اس سے ایک افراتفری پھیل گئی۔ کمپنیوں کا باہمی رابطہ ٹوٹ گیا اور فورس کمانڈر سے بھی ان کا ابلاغ ختم ہوگیا۔ اب وائرلیس پر لیفٹیننٹ خان زمان کے سوا کسی کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس نے عقب میں موجود توپ خانے سے فائر مانگا، چنانچہ پاکستانی دستوں نے بھرپور گولہ باری کی۔

فورس کمانڈر تشویش کا شکار تھے کہ لیفٹیننٹ اختر کہاں گئے۔ دن بھر ان کا رابطہ اپنی فوج سے کٹا رہا، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا وائرلیس سیٹ خراب ہوگیا تھا، پھر یکا یک وائرلیس پر ایسی مدھم سی آواز سنائی دی، جس کی شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بے تدبیری یہ تھی کہ کوئی خفیہ شناختی لفظ، کوڈ ورڈ، بھی مقرر نہ کیا گیا تھا۔ مدھم آواز میں بولنے والے نے بتایا کہ وہ لیفٹیننٹ اختر ہے اور اس نے دشمن کے مورچوں پر گولہ باری کی درخواست کی۔ اگلے 45 منٹ تک پانڈو کی پہاڑی اور گرد و نواح کا علاقہ پاکستانی توپ خانے کی گولی باری سے لرزتا رہا۔ ''یہ کمال مہارت اور ہم آہنگی سے کی جانے والی گولہ باری تھی۔'' بعد ازاں ایک افسر نے کہا، ''اس گولہ باری کی آڑ میں لیفٹیننٹ اختر اور خان زمان آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس روز ہمارے توپ خانے اور ان بہادر نوجوانوں نے ایسی بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ گنرز ہمیشہ ان پر فخر کرتے رہیں گے۔'' چوبیس گھنٹے جاری رہنے والی لڑائی 27

جولائی کو ختم ہو گئی، جب پانڈو کی ٹیکری پر پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا، ان رفعتوں پر یہ پرچم آج بھی لہراتا اور مادر وطن کے شہید سپوت کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بیشتر فوجی کہتے ہیں کہ اگر اس پہاڑی پر قبضہ نہ کیا جاتا، جہاں سے دشمن اب پاکستانی توپ خانے کی زد میں تھا تو گردو پیش کا بہت سا علاقہ پاکستان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں، جو کہتے ہیں کہ اگر ایک فوجی اپنے وطن کے لیے لڑتا اور کامیابیاں حاصل کرتا ہے تو اس میں کمال اور کارنامے کی کیا بات ہے کہ ایسا کرنے کی اسے تنخواہ دی جاتی ہے۔ اخبارات کے لیے تبصرے لکھنے اور ہوٹلوں میں گپ اڑانے والے زود رنج دانشور نہیں جانتے کہ انسانی زندگی ایک ایسی چیز ہے، جس کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔ جب جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے، فضا بارود کی بو اور لوہے سے بھر جاتی ہے تو یہ سکھائے پڑھائے سبق نہیں، جو آدمی کے کام آتے ہیں۔ اس وقت صرف وہی سرخرو ہوتا ہے، جو خوف اور کنفیوژن میں اپنا ذہن اور حوصلہ بروئے کار لا سکتا ہے، جو جان نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

اس روز جب دشمن کی پوزیشنوں کا جائزہ لینے کی بے تابی میں اختر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر آگے چلے گئے تھے، تو یونٹ میں ان کی شہادت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ بعد وہ ہنستے ہوئے کہا کرتے تھے،''میں تو اپنی زندگی ہی میں شہادت کا اعزاز حاصل کر چکا ہوں۔شہادت، کم گو آدمی کے غور و فکر اور اظہار خیال کا ایک پسندیدہ موضوع تھا، اس حوالے سے انہوں نے اگلے چار عشروں میں سینکڑوں ہزاروں بار اپنے ماتحتوں کو یہ پیغام دیا کہ دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں سے بہتر سپاہی پیدا نہیں کر سکتی۔ 23 جون 1988ء کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے رسالپور میں پاک فضائیہ کے فلائنگ اور انجینئرنگ کیڈٹوں کی پاسنگ اوٹ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا،''ایمان نہ صرف ہر قسم کی راہ نمائی کا سرچشمہ ہے ، بلکہ امن ہو یا جنگ مسلمان سپاہی کو فعال بنانے کا واحد جذبہ محرکہ بھی یہی ہے۔''

مدتوں بعد بھی پانڈو کے محاذ پر اپنی اکثریت کے باوجود پسپا ہونے والے 163 سکھ بریگیڈ کے کمانڈر سے لندن میں اچانک ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے بے اختیار پاکستان کے لیے دس ہزار فٹ اونچی چوٹی فتح کرنے والوں کے حوصلے اور ہمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس نے کہا،'' تم فتح کے مستحق تھے۔'' گنتی کی جو چند توپیں پاکستانی دستوں کے پاس تھیں، وہ ان بلندیوں پر کس طرح پہنچائی گئی تھیں، 41 سال پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے توپ خانے کے ایک سپاہی نے بتایا،'' ہم نے ان کے پرزوں کو الگ الگ کیا، اور کندھوں پر اٹھا کر اوپر لے گئے۔ یہ اس قدر پر مشقت کام تھا کہ علاقے کے اس سرد موسم میں ہماری وردیاں پسینے میں بھیگ گئیں، لیکن اس روز ہم پر شوق اور جنون کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔ اس روز تو کوئی پہاڑ بھی ہمارا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔''

پاکستان کے دورے پر آنے والے غیر ملکی فوجی افسروں کو جنہیں پاکستان کے عسکری نظام اور فوجی تاریخ سے متعارف کرانا مقصود ہو، دوسرے مقامات کے علاوہ پانڈو کی اس ٹیکری پر بھی لے جایا جاتا ہے۔ ترکی، آسٹریلیا، اور امریکہ سے آنے والے ہمیشہ حیرت سے سوال کرتے ہیں کہ ان بلندیوں پر توپیں کیسے پہنچا دی گئیں؟

جولائی 1948ء میں پانڈو کے محاذ پر سپاہی کے دل میں کشمیر سے محبت کا جو کھوا پھوٹا تھا، وہ رفتہ رفتہ تناور درخت بن گیا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی اس راز سے آگاہ تھے کہ یہ شخص کشمیر کے محاذ پر ایک فیصلہ کن معرکے کی بے تاب آرزو اپنے دل میں آباد کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جون 1976ء سے 1976ء کے آخری دنوں تک وہ جب کبھی مری گئے، جہاں بریگیڈئر اور بعد ازاں میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن مری کے جی او

سی کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے، تو وہ انہیں بلا بھیجتے۔ بھٹو گرما کی شدت میں تفریح، غور و فکر اور بسا اوقات اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں کے لیے مری کا رخ کرتے تھے، لیکن وہ عام طور پر اس کمانڈر سے گفتگو کو وقت ضرور نکال لیتے، جو محاذ کشمیر کے حوالے سے کمال وارفتگی اور مہارت کے ساتھ گفتگو کرتا تھا۔ مسٹر بھٹو یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اگر بھارت اس سرحد پر حملہ کر دے تو پاکستان کی حکمت عملی کیا ہوگی اور پاک دستوں کی کارکردگی کیسی رہے گی۔ اپنے مخالفین کو فنا کرنے کی آرزو رکھنے والے متنازعہ بھٹو کے مخالفین ان پر بھارت کے معاملے میں نرم گوشہ رکھنے کا الزام عائد کرتے رہے ہیں۔ بھٹو نے اپنے اقتدار کے لیے خواہ کیسے ہی کھیل کیوں نہ رچائے ہوں، لیکن خطرات مول لے کر پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کرنے والا یہ سیاست دان پاکستان کے روایتی دشمن کے بارے میں اپنی بیٹی سے مختلف رویہ رکھتا تھا۔